

## عصر حاضر میں اُردو افسانے کے بدلتے رجحانات

ڈاکٹر محمد اعجاز تبسم

اسسٹنٹ پروفیسر اُردو

لاہور گیریٹن یونیورسٹی، لاہور

### CHANGING TRENDS IN CONTEMPORARY URDU FICTION

Ijaz Tabussum, PhD

Assistant Professor of Urdu

Lahore Garrison University, Lahore

#### Abstract

Urdu fiction is proving to be helpful in developing a new global consciousness. It has attained the height of artistic maturity owing to the employment of symbolism. The Urdu fiction has the full potential to portray cultural chaos, decaying morality, sexual perversion, instability, aggression, terrorism, issues related to family life, apathy, selfishness, egoism, snobbery, disappearance of middle classes, social and political interests, loneliness, psychological disturbances, soulless life, a sense of exile, self-made religious beliefs etc. Specimens from different short stories have been incorporated in the article to show the changing trends in contemporary Urdu fiction.

#### Keywords:

بانو قدسیہ، اشفاق احمد، اُردو، افسانہ، تحریک آزادی کشمیر، عراق، افغانستان

عصر حاضر میں اُردو افسانہ بدلتے ہوئے تہذیبی و سماجی رجحانات کے پیش نظر اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے اک نئے عالمی شعور کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ فنی پختگی کا یہ عروج اسے سماج اور زندگی کی قربت سے عطا ہوا۔ اس نے تہذیب و مذہب اور دیگر سماجی اقدار کے مجروح ہونے کے خیال سے علامتی انداز اپنایا اور یہ سفر اس کی مقبول ترین منزل ثابت ہوا۔ یہ علامتی جہات گذشتہ صدی کے جن افسانہ نگاروں نے متعارف کروائیں ان میں سے بعض کا انتقال بیسویں صدی میں ہی ہو گیا تھا اور بعض کا انتقال اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں ہوا۔ پچھلی ایک صدی کے نمائندہ افسانہ نگار، جنہوں نے سماجی اقدار کی تنزلی، انسان کی جنسی بے راہ روی، اخلاقی اقدار کی پامالی اور دیگر مسائل زمانہ کو موضوعِ بحث بنایا، وہ یقیناً داد و تحسین کے مستحق ہیں، جن کی کاوشوں سے اُردو افسانے کو یہ مقام نصیب ہوا۔ ان میں بالخصوص پریم چند (۱۸۸۰-۱۹۳۶ء)، سلطان حیدر جوش (۱۸۸۶-۱۹۵۳ء)، یلدرم (۱۸۸۰-۱۹۳۶ء)، منٹو (۱۹۱۲-۱۹۵۵ء)، عصمت چغتائی (۱۹۱۵-۱۹۹۱ء)، انور سجاد (۱۹۳۵-۲۰۱۹ء)، انتظار حسین (۱۹۲۵-۲۰۱۶ء)، خدیجہ مستور (۱۹۲۸-۱۹۸۲ء)، بانو قدسیہ (۱۹۲۸-۲۰۱۷ء)، اشفاق احمد (۱۹۲۵-۲۰۰۵ء)، قدرت اللہ شہاب (۱۹۱۷-۱۹۸۶ء)، احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶-۲۰۰۶ء)، عبداللہ حسین (۱۹۳۱-۲۰۱۵ء)، قرۃ العین حیدر (۱۹۲۶-۲۰۰۷ء)، رحمان مذنب (۱۹۱۵-۲۰۰۰ء)، ممتاز مفتی (۱۹۰۵-۱۹۹۵ء)، بلونت سنگھ (۱۹۲۱-۱۹۸۶ء)، راجندر سنگھ بیدی (۱۹۱۵-۱۹۸۳ء)، کرشن چندر (۱۹۱۳-۱۹۷۷ء)، انیس ناگی (۱۹۳۹-۲۰۱۰ء)، غلام عباس (۱۹۰۹-۱۹۸۲ء)، جوگندر پال (۱۹۲۵-۲۰۱۶ء) اور رام لعل (۱۹۲۳-۱۹۹۶ء) قابل ذکر ہیں۔

عصر حاضر میں اُردو افسانہ اپنی جدت، موضوعات کے متنوع اسلوب اور تکنیک کی بنا پر اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنا تہذیبی رشتہ نہ صرف اپنے ماضی سے برقرار رکھا ہے بل کہ اپنے خارجی ماحول اور انسان کے باطن میں جھانک کر، سماجی حالات کی تلخیوں، حالاتِ حاضرہ اور انسانی رویوں میں ممکنہ تبدیلیوں کو بھی اپنے مخصوص بیانیے کا حصہ بنایا ہے جس کی بنا پر اس صنفِ ادب میں وسعت و ہمہ گیری نے جنم لیا ہے۔ ڈاکٹر سید زبیر شاہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آج کا افسانہ صرف خارجی ماحول سے آشنا ہی نہیں بل کہ انسان کے باطن سے بھی آگاہ دکھائی دیتا ہے۔ حالات کی کش مکش، واقعات کی تلخیوں اور

گوناگوں تبدیلیوں نے جدید افسانے کو مختلف موضوعات کے علاوہ کئی تکنیک، اسلوب اور بیانیے بخش دیے ہیں جس سے افسانے کا کیوس وسع تر ہو چکا ہے۔ (۱)

عصر حاضر میں رضیہ فصیح احمد (۱۹۳۴ء)، طاہر نقوی (۱۹۴۲ء)، عذرا نقوی (۱۹۵۲ء)، مہتاب عالم پرویز (۱۹۶۶ء)، اشتیاق سعید (۱۹۶۴ء)، حمید شاہد (۱۹۵۷ء)، منشا یاد (۱۹۳۷-۲۰۱۱ء)، عالم خاں (۱۹۴۸ء)، نیر مسعود (۱۹۳۶-۲۰۱۷ء)، امجد طفیل (سن ندارد)، زاہدہ حنا (۱۹۴۶ء)، شاہین کاظمی (سنہ ندارد) اور دیگر افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کے بدلتے رجحانات کے پیش نظر خود آگے اور تہذیبی ورثہ کی کھوج کو اپنا فرض اولین قرار دیا ہے۔

رضیہ فصیح احمد ”ہنسی کی بات“ میں عصر حاضر کے اخلاقی زوال کو بڑی مہارت سے موضوع بحث بناتی ہیں جس میں مغرب کی کھوکھلی اقدار کو دکھانے کے لیے ”مائیکل اور آریلین“ دو مرکزی کرداروں کا سہارا لیا گیا ہے۔

طاہر نقوی کی کہانی ”فاریسٹ آفیسر“ بھی عصر حاضر میں تغیر پذیر سماج کی بے سمت زندگی اور انسان کی نفسیاتی الجھنوں کو بہ خوبی ظاہر کرتی ہے۔ زندگی کے جنگل میں بھٹکنے کے بعد واپسی کا راستہ مشکل سے ہی ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانے ”بند لبوں کی چیخ“ میں اکیسویں صدی کے انسان کی معاشی مجبوریوں، اس کے ذہن و جذبات کی کش مکش اور زوال آمادہ اخلاقی قدروں کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل عصر حاضر انسان میں شرافت کا لبادہ اوڑھے منتشر خیالات کی کہر میں ڈوبا ماضی کے لمحات کا پچھتاوا اپنی چشم بے نور میں سجائے دکھوں کی دل دل میں پھنس چکا ہے۔ اس عہد میں سماجی کرب، معاشی مجبوریاں اور تہذیبی قدریں انتہائی سرعت کے ساتھ اپنا چولا بدل رہی ہیں۔ موجودہ انسان کو مذہبی انتہاپسندی اور سماجی دہشت گردی نے اخلاقی گراؤ کا شکار کر دیا ہے لیکن وہ اپنی ذمہ داریاں عزم صمیم کے ساتھ نبھانے کے لیے پھر بھی تیار ہے:

ذہن و جذبات کی کش مکش سے اسے نجات کسی صورت نہیں مل رہی تھی اسے اپنی ماں اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال آتا تو وہ کانپ کر رہ جاتا اور زندگی کی یہ مجبوریاں اس کے ہونٹوں پر شرافت کا ہاتھ رکھ دیتیں، ارادے کی دھوپ اب منتشر خیالات کی کہر میں ڈوب گئی تھی۔ شیشے کا گھر حالات کے پتھروں سے چکنا چور ہو جانے کے خیال

سے وہ لرز اٹھا۔ پچھلے لمحات اور واقعات پچھتاوے بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے جنہوں نے نشتر بن کر اس کی زندگی میں جنم لیا تھا۔ وہ ان سے اب دامن نہیں بچا سکتا تھا اور نہ آنکھیں ملا سکتا تھا۔ (۲)

اس افسانے میں انسان کے اندر احساسِ ذمہ داری کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ انسانی قدروں کو بھول کر دولت کا پجاری بن گیا ہے۔ اب عہد حاضر کے انسان کو معاشی بحران اور سر پر غربت کے اگے ببول کی چھین کا احساس، دل و دماغ کو ریزہ ریزہ کرتی حسرتیں، غریبی و امیری کا موازنہ اور روپے پیسے کی غیر منصفانہ تقسیم اک پچھتاوا بن کر سانپ کی طرح ڈس رہی ہے۔ دراصل زندگی کے آلام اور اس کے بدلتے تقاضوں کا سامنا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہیں۔ انسان کی حسرتوں کا اصل مرکز و محور اس کے فطری جذبات و احساسات اور اس سے منسلک رشتے ہیں۔ وہ عزم و ہمت کا کوہ سار بن کر کہیں انہیں نبھاتا اور کہیں ان سے آنکھیں چراتا نظر آتا ہے۔ ”بدلتے لمحوں کا دکھ“ اس افسانے میں طاہر نقوی نے امارت اور غربت میں بنیادی فرق واضح کر کے نام نہاد انسانیت کو جھنجھوڑا ہے:

اس نے محسوس کیا جیسے وہ کوڑا کرکٹ ہو اور کوڑے کے ڈھیر میں پڑا ہو۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر ماتھے سے خون کی بوندیں آنکھوں اور ناک تک آگئیں ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک خوش لباس آدمی نے کار سے اتر کر اسے سہارا دیا جیسے ردی کاغذ پھینکنے والے کو احساس ہو جائے کہ کہیں کام کا کاغذ تو نہیں پھینک دیا اس لیے دوبار اسے اٹھا کر دیکھے اور بیکار ہی نکلنے پر پھر ایک طرف ڈال دے۔ جیب سے پانچ کانوٹ اسے تھماتے ہوئے بولا: ”یہ لومر ہم پٹی کرا لینا۔“ اس نے غصے سے ہتھیلی پر رکھے ہوئے نوٹ کو دیکھا جیسے یہ غربت کا سانپ ہو جس کا زہر اس کے بچوں کی اور اس کی بیوی کی زندگیوں میں پہلے ہی پھیل چکا تھا۔

غربت کا احساس ذہن و دل دونوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر جائے اس کی ٹائی پکڑ کر جھینکا دے اور یہ نوٹ اس کے منہ پر دے مارے۔ (۳)

درج بالا افسانہ ہمارے زوال پذیر سماج کے اس بالادست طبقے کی ہٹ دھرمی اور متوسط و تباہ حال طبقات کے جذبات کا نوحہ ہے جو ساری عمر غربت کی شال اوڑھے سسک سسک کر گزارا کرتے

ہیں۔ ان کی آرزوئیں اور دکھ بھری آہیں اندر ہی اندر دم توڑتی رہتی ہیں۔ عصر حاضر کے انسان کا اخلاقی و معاشی زوال نہ صرف اس کے سماج پر اثر انداز ہو رہا ہے بل کہ زمانہ استقبال کی تباہ حالی کی پیشین گوئی بھی کر رہا ہے۔ موجودہ انسان صرف دولت کا بھوکا ہے اس کے اندر کا باوقار اور پُر خلوص انسان موجودہ صدی میں بڑی تیزی سے معدوم ہو رہا ہے۔ وہ سماجی اقدار اور تہذیب و شائستگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی خودی و خودداری کی موت خود مر رہا ہے۔

عذرا نقوی نے اپنے افسانوں میں نہایت نازک خیالی اور فنی مہارت سے اکیسویں صدی کے سماج کی الجھنوں اور متغیر ہوتی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ وہ انسان کے دامن سے وابستہ حسرتوں اور اداس لمحوں کی افسانہ نگار ہیں، حقائق زمانہ سے آنکھ نہیں پراتیں بل کہ کئی عیوب و معاملات کو اپنے افسانوں میں سوز و گداز کے ساتھ پیش کرنے کی مہارت رکھتی ہیں۔ انھوں نے کہیں کہیں تہذیبی بگاڑ اور سماجی رویوں کے المیاتی تاثر کو بھی پیش کیا ہے۔ عصر حاضر میں انسان کا اخلاقی زوال اور مرتے ہوئے تہذیبی رویے ان کے افسانوں میں ایک دردناک چہن بن کر ابھرتے نظر آتے ہیں۔ اس نے روحانی زندگی سے خود کو برطرف کر کے مادیت پرستی میں کس حد تک اپنے آپ کو مدغم کر لیا ہے۔

عذرا نقوی اپنے افسانوی مجموعے آنگن جب پردیس ہوا میں مشمولہ کہانی ”الہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے“ میں اکیسویں صدی کے انسان کی نت نئی مصروفیات، ظاہری اور داخلی صورت کے رجحانات، شخصیتی تضادات، درس گاہوں میں اس کی کردار کشی، اخلاقی زوال، عبادت گاہوں میں ریاکاری کے مناظر، مذہبی تقدس کی پامالی، جنسی ہوس، انسان کے ہاتھوں قربان ہوتی اخلاقی اقدار و روایات اور عصری حسیت کو بہ طریق احسن اپنی افسانوی تخلیقات کا حصہ بناتی ہیں، جس میں انھوں نے سماج کو طنز کے نشتر سے الفاظ کا روپ دیا ہے:

”گاڑی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ہماری گاڑی سے ٹیک لگائے ایک نوجوان جوڑا دنیا سے

بے خبر، ایک دوسرے میں کھویا ہوا کس (Kiss) کر رہا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر دونوں

نے سر اٹھایا۔ لڑکے نے انگریزی میں کہا: ”کتنی خوب صورت رات ہے۔“ (۴)

”بیک ڈور“ مہتاب عالم پرویز کا بہت عمدہ افسانہ ہے اس میں دور حاضر کے انسان کے اخلاقی زوال، سماجی مسائل اور نفسانی خلفشار کو نہایت عمدگی سے صفحہ قرطاس پر بکھیرا گیا ہے۔ اکیسویں صدی

کے سماج کا گھناؤنا چہرہ ایک حور کا ساقب اوڑھے عصر حاضر کے انسان کو اپنا گرویدہ بنا رہا ہے، اس صورت میں جنسی بھوک اور تنہائی کا کرب اسے اپنے لاشعور کے نادیدہ جزیروں کی جانب دھکیل رہا ہے جس سے اس کی روحانی زندگی متاثر ہوئی ہے۔ یہ جنگ وہ اپنے آپ سے پچھلے کئی برسوں سے لڑ رہا ہے لیکن جیت ہر دفعہ اس کے اندر چھپے ان دیکھے خوف کی ہوتی ہے۔ انسان ساری زندگی کرب سہتا اور کرب سے گزرتا ہے مگر کہیں کہیں تاریک راہوں میں اجلاسویرا بن کر امید کے لمحات اسے تھام لیتے ہیں۔ اس نے اس جسدِ خاکی میں ارمانوں کے کئی محل تعمیر کر رکھے ہیں جن کی سراب انگیز ساعتیں اس کے لیے تکلیف دہ ہیں مگر ان تصوراتی محلات کا بھیانک چہرہ اس کی زندگی کے اندر جلتے آرزوؤں کے الاؤ کو دھندلا کر رہا ہے:

مجھے معاف کر دو میرے بھائی، کبھی کبھی انسان آرزوؤں کے چہروں کے ان گنت محل  
تعمیر کرتا ہے مگر مجبوریاں اس کے تعمیر کردہ ان تصوراتی مخلوق کو پک جھپکتے ہی زمین  
بوس کر دیتی ہیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ اپنے بھائی کی شادی میں اپنے ہاتھوں سے  
سہرا باندھوں گا لیکن انسان کی ہر خواہش تکمیل تک نہیں پہنچ پاتی۔ ہر خواب کی تعبیر  
نہیں ہوتی — (۵)

اشتقاق سعید کی کہانی ”بعید از قیاس تسکین“ میں عصر حاضر کے سماج کی حقیقی زندگی کا صحیح  
رخ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔  
ایک شادی شدہ عورت، جواں سالہ دو کنواری بیٹیاں ہونے کے باوجود سماج کے منہ پر کلنک کا ٹیکا ہے۔  
اسے اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اپنی اولاد کی تربیت اور اپنی عزت کا خیال رکھنا چاہیے تھا مگر وہ جنسی  
بے راہ روی کا شکار ہو چکی ہے۔ وہ پیٹھ پیچھے اس کی عزت کو تار تار کر کے اک ایسی اس دل دل میں دھنس  
چکی ہے جس سے اب نکلنا ناممکن ہے۔ حاضر غائب میں لکھی گئی یہ کہانی ہمارے ہی سماج کی کرب ناک  
تلخیوں اور زوالِ تہذیب کو اجاگر کرتی ہے۔

ایک کفن اور اشتقاق سعید کا یہ افسانہ پریم چند کے کفن کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ مصنف نے  
بڑی مہارت سے انسان کے باطنی اور خارجی تضاد کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے کے کردار بھی مادھو گھیسو  
اور بدھی ہیں۔ دراصل موجودہ انسانی تہذیب پر وحشت و بربریت کا بھوت سوار ہے۔ اس کی بے حسی

نے اس کے روحانی تقدس کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ گھیسو، مادھو اور بدھیا اس زوال آمادہ سماج کے بے حس کردار ہیں۔ دیکھا جائے تو بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کے سماج میں کچھ خاص فرق دکھائی نہیں دیتا ہے۔ مٹی پریم چند نے چوراسی سال پہلے اس کا نقشہ کھینچا تھا اور اب اشتیاق سعید بھی اسی کے طرف دار نظر آتے ہیں۔ انسان نے اس دانش و حکمت اور ترقی کے باوجود اپنے تہذیبی و سماجی رویوں کو نہیں بدلا بلکہ وہ اپنے اصل منصب سے گرتا ہی دکھائی دیتا ہے۔

اس افسانے میں نہایت خوب صورت علامت و رموز کے ساتھ ابتدا میں ہی منظر کشی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ رات کی کوکھ سے صبح کا جنم، کہراؤد فضا، کھرنجے کی سڑک، خمار کافور ہونا جیسے الفاظ اور انسان کی بے حسی اکیسویں صدی کے بے حس، نامراد اور خون آشام سماج کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے:

رات کی کوکھ سے صبح کا جنم ہوا ساتھ ہی مادھو کا خمار بھی ٹوٹا۔ اس نے کروٹ بدلی کہ  
 یکایک جسم کو چھید دینے والی ہوا کا ایک جھونکا اس پر کپکپی طاری کر گیا۔ وہ کسمسا کے اٹھ  
 بیٹھا اور خود کو یوں کہراؤد فضا میں گم کھرنجے کی سڑک پر پڑا پا کے استعجابیہ نگاہوں سے  
 اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ دیکھا چند گز کے فاصلے پر اس کا باپ بھی گھٹنوں کو پیٹ سے  
 لگائے بے سدھ پڑا ہے اور ایک کتنا ناگ اٹھائے اس کے منہ پر موت رہا ہے۔ یہ دیکھتے  
 ہی اس کا رہا سہا خمار بھی کافور ہو گیا اور وہ بیٹھے بیٹھے ہانکنے والے انداز میں کتے کی جانب  
 ہاتھ لہراتے ہوئے ڈانٹنے لگا۔ (۶)

اشتیاق سعید نے موجودہ انسان کے تہذیبی بحران، معاشی بد حالی، اخلاقی زوال اور جنسی بے راہ روی کو بہ طریق احسن اپنی کہانیوں میں سمو دیا ہے، کہیں بھی منفی تاثر نہیں ابھرتا۔ وہ تہذیبی و سماجی رویوں میں تغیر، سسکتی اور کرب میں مبتلا زندگی کے منظر نامہ کی تصویر کشی بہترین انداز میں کرتے ہیں۔ ”بہ رضائے صنم“ میں بھی عصر حاضر کے ایک نوجوان کی جنسی بے راہ روی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رگ رگ میں شراب و شباب کا سما جانا، دل مضطرب ہونا، حلق میں چھن ہونا اور روح میں بے چینی بھرنے لگنا یہ ایسی کیفیات ہیں جو انسان کو کسی کی زلفوں کا اسیر بتاتی ہیں۔ اس میں ایک نوجوان ریشماں نامی عورت کے جسم کا خواہش مند ہوتا ہے۔ وہ دن بھر اپنے روزگار میں تو الجھا رہتا ہے مگر اسے

داخلی ودلی تسکین اس کے وصال سے ہی میسر ہوتی ہے۔ اشتیاق سعید نے بلا مبالغہ اکیسویں صدی کے سماج کی عصری معنویت کو الفاظ کا روپ دے کر عہدِ حاضر کی نوجوان نسل کی بے روح زندگی اور غیر اخلاقی رویوں سے پردہ اٹھایا ہے:

پھر تو میں باقاعدہ طور پر ریشماں کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہنے لگا تھا۔ دن بھر اپنے روزگار میں الجھا رہتا لیکن شام ہوتے ہی میرے اندرون میں ایک طرح کی کش مکش جاری ہو جاتی، دل مضطرب ہو جاتا، حلق میں چھن سی ہونے لگتی۔ لبوں میں جنبش در آتی، جسم کسی گداز، جسم کا تعارف چاہنے لگتا۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں میرا رگ رگ شراب و شباب کا عادی ہو گیا تھا۔ (۷)

مذکورہ بالا افسانے کے اس اقتباس سے واضح ہے کہ اشتیاق سعید نے بے الفاظ میں انسان کے اخلاقی و روحانی زوال کو اپنی کہانی کا حصہ بنایا ہے۔ ماضی میں اس کے تہذیبی رویے، سماجی تقاضے اور زندگی کا حسن موجودہ انسان کی زوال آدہ تہذیب کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو عصر حاضر کے اردو افسانے میں اخلاقی زوال کی نوحہ گری، جنسی بے راہ روی، جسمانی لذت کوشی، سماجی رویوں کا تغیر، شخصی تضاد، ریاکاری اور مذہبی تقدس کے نام پر قربان ہوتی اشرافیہ اس کے غالب موضوعات ہیں۔

زاہدہ حنا اور شاہین کاظمی نے اپنے افسانوں میں عائلی زندگی، دہشت گردی، تائیدی فکر و فلسفہ، سرمایہ داری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات جیسے مباحث کو شامل کر کے اسے اور بھی معنی خیز بنا دیا ہے۔ ارمانوں کی آگ میں سلگتی زندگی، سماجی اقدار اور تہذیبی رعنائیوں سے دور ہوتے قلوب جہاں مادیت پرستی کا خول اپنے چہرے پر چڑھائے بے حس انسانیت سے نبرد آزما دکھائی دے رہے ہیں، وہاں در بہ دری کا احساس اور جنسی بھوک بھی اک کرب کی صورت میں اپنا عکس دکھا رہی ہے۔ عصر حاضر میں لمحہ بہ لمحہ واقعاتِ زمانہ اور مختلف تبدیلیوں سے ہم کنار ہوتی زندگی جدید اردو افسانے کا موضوع بنی۔ بہ ہر کیف اس میں سماجی و مذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر پھیلنے والی بد امنی، جنگ و جدل کے نہ ختم ہونے والے سلسلے، افغانستان میں سسکتی بلکتی زندگی کے مناظر، مسلم ممالک پر روس اور

امریکی جارحیت، نائن الیون اور دہشت گردی، تحریک آزادی کشمیر، تحریک آزادی فلسطین اور عراق پر امریکی مظالم کی اندوہ ناک داستان رقم لاتی ہے:

زاہد حنا نے فلسطینی مسلمانوں پر یہودیوں کے ڈھائے جانے والے ظلم و ستم، تحریک آزادی کشمیر، افغانستان پر روسی و امریکی جارحیت اور اس کے باعث چھڑنے والی جنگ، ان کی پاکستان ہجرت نائن الیون کے رد عمل میں پھیلنے والی دہشت گردی اور دیگر واقعات و مسائل زمانہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ (۸)

تقسیم ہند کے دوران پیدا ہونے والی تہذیبی و سماجی صورت حال نے اردو ادب کو بے حد متاثر کیا چنانچہ منٹو، بلونت سنگھ، کرشن چندر، بیدی، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں نے ہجرت کے اس کرب کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اسے شعوری طور پر اپنی تخلیقات کا حصہ بھی بنایا۔ زاہد حنا کے کئی افسانے اسی تہذیبی روایات کا تسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اردو کے افسانوی ادب کی روایت سے جڑی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ بالخصوص انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا افسانوی رنگ ان کے اسلوب کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔ طارق چغتاری کا کہنا ہے:

ان کے افسانے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے فن کی آمیزش معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تقسیم ہند کا کرب بھی موجود ہے اور بے ذہنی کا احساس بھی۔ (۹)

سماج میں ہجرت کے اسی کرب اور بے ذہنی کے احساس نے انھیں اپنی سرزمین کے ساتھ جڑے رہنے پر آمادہ کیا ہے۔ اس سرزمین اور دھرتی کی کوکھ سے جنم لینے والے دکھوں، اس پر ہونے والے ظلم و ستم اور نا انصافی کو دیکھ کر ان کا دل کڑھتا ہے۔ اسی اندوہ ناک صورت حال کی وجہ سے ان کے قلم کی دھار سے الفاظ بہتے لہو کی مانند نکلتے ہیں۔ انھوں نے جن افسانوی مباحث کو چھیڑا ہے وہ عالمی سطح پر پھیلے سماجی مسائل اور دیگر عصری رجحانات کے عکاس نظر آتے ہیں۔ عصر حاضر میں دندناتی بے حس اشرافیہ جس نے نام نہاد مذہب کی آڑ میں نسل انسانیت کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اس سرزمین کا بیشتر حصہ جنگ کی لپیٹ میں ہے جہاں روتی بلکتی، سسکتی، اپنوں سے مچھرتی اور تنہائی کا ڈکھ سہتی انسانیت اک سوالیہ نشان بن کر زاہد حنا ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتی نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر احمد عقیل روبی نے زاہد حنا کو اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔ (۱۰)

آفاقی شہرت کے حامل افسانہ نگاروں نے اپنے تہذیب و سماجی شعور کے پیش نظر سچ کی تلاش، جدوجہد آزادی، مظلوم کی دادرسی، ستم گر سے نفرت کا اظہار، حقوق انسانی کے لیے تگ و دو، انسانیت کی قدر، سماجی و تہذیبی اقدار کی پابلی، تہذیبی روایات سے بغاوت، اکیسویں صدی کے انسان کی داخلی منافقت اور دیگر مسائل زمانہ کو اپنے موضوعات کا حصہ بنایا یہی فکری رو زائدہ حنا کے افسانوں میں برق رفتاری سے دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔ جدید انسان نے اپنی ساری دانش و حکمت کے باوجود ابھی تک پیٹ کی آگ اور جنسی بھوک پر قابو نہیں پایا۔

زائدہ حنا ”قص بسمل ہے“، ”راہ اجل میں ہے“، ”قیدی سانس لیتا ہے“ میں قاری کی توجہ عالمی سطح پر استعماری قوتوں کے ظالمانہ اقدامات کی طرف مبذول کرتی ہیں۔ وہ اپنے ان افسانوں میں عراق کے تہذیبی شہر بغداد، بصرہ میں امریکی جارحیت، انسانی جانوں کا ضیاع، بارود کی بھٹی میں جلنے بھٹنے انسانی جسم، معصوم بچوں کی آہیں، عورتوں کی فریاد اور بزرگوں کی دہائیاں، صدیوں پرانی تہذیبی میراث اور آثارِ قدیمہ کے مٹنے کا غم اس جگر کاوی سے بیان کرتی ہیں کہ قاری کا عہدِ رفتہ کی صد اکتوں پر ایمان و ایقان مزید پختہ ہو جاتا ہے۔ اپنے بہترین تاریخی شعور کے بل بوتے پر وہ اس کو آتشِ نمرود، حضرت ابراہیم اور جنگِ عظیم دوم میں جاپان پر ڈھائے گئے امریکی سے منظم جوڑتی ہیں:

انہوں نے بغداد کو پاپ کارن مشین بنا دیا جس میں وہ عراقیوں کو، بھٹے کے دانوں کی طرح بھون رہے ہیں۔ یہیں کہیں آتشِ نمرود بھی دہکائی گئی تھی لیکن آتشِ نمرود تو ہر زمانے اور ہر زمین میں دہکائی گئی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی، مائی لائی اور تورا بورا، بغداد اور بصرہ، آتشِ نمرود کا امریکی ورژن، نمرود نے سارا اہتمام اکیلے ابراہیم کے لیے کیا تھا۔ (۱۱)

زائدہ حنا کا تمثیلاتی اور تلمیحاتی رنگ ان کے فکر و شعور کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے وسیع مطالعہ اور تاریخی ذوق کے بل بوتے پر کئی تاریخی واقعات اور انسانی بے حسی کے مختلف ادوار کو الفاظ کے تاج محل میں سجا دیتی ہیں۔ انہوں نے اکیسویں صدی کے انسانی رویوں کو بڑی فنی پختگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کے تمام حقائق اپنی سچائیاں اگل دیتے ہیں۔ زائدہ حنا اپنے افسانوں میں انسانی روح کو اضطراب پرور صورت میں اداسیوں کا رنگ دے کر احسن طریقے سے پیش کرتی ہیں۔ اس میں ان کے

ہاں انسانی فطرت کے مختلف رنگ، کہیں تضادات کی شکل میں تو کہیں نفرت کی صورت میں ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں عصر حاضر کے انسان کے نفسیاتی مسائل اور سماجی خلفشار کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہندوستانی سماج کے تمام پہلو، کرب اور تنہائی، جبر و تشدد کے کئی رنگ، جنگی مناظر اور تاریخی حقائق ایک فطری سوز و گداز کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

زاہدہ حنا کے افسانوں میں موت کی بازگشت اور زندگی کے مختلف سماجی رنگ چار سو اپنا عکس بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تلخ و شیریں حقائق زمانہ، عروج و زوال اور ملک گیری کی ہوس، ان کی کہانیوں کے خاص موضوعات ہیں۔ انھوں نے ”نیند کا زرد لباس“ میں بچے کی معصومیت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر پلٹی نفرت و بغاوت، ترقی پذیر ممالک پر ڈھائے جانے والے مظالم، بین الاقوامی ناانصافی اور اس کے تیسری دنیا کے ممالک پر پڑنے والے مضر اثرات کو بہ خوبی پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں امریکی جارحیت عراق اور خاص کر افغانستان پر ڈھایا جانے والا ستم دیکھیے:

میری بہن پروانہ اور میرا بھائی جلال اس بم باری میں مارے گئے۔ آپ نے میرے بھائی بہن چھینے، میرا شہر، میرا گھر، میری گلیاں، میرا بچپن، میرے خواب چھینے، آپ نے میری ہتھیلی بھی چھین لی۔ آپ کے بھیجے ہوئے جہاز جب ہمارے لیے بسکٹ کے پیکٹ، مکھن کی ٹکیاں اور رنگ رنگ کی تئلیاں گرا رہے تھے تو میں اور میری کئی سہیلیاں ان تئلیوں کو اٹھانے کے لیے بھاگیں بسکٹ کے پیکٹ اور مکھن کی ٹکیاں اٹھانے والے بچے گئے۔ (۱۲)

اس اقتباس سے ظاہر ہے مصنف نے کس فنی چابک دستی سے عصر حاضر میں انسانی بے حسی کی تصویر کشی کی ہے۔ جاہ و ثروت اور طاقت کے نشے میں چور ترقی یافتہ ممالک کیسے ترقی پذیر ممالک کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد وہاں کی تہذیب، سماجی اقدار و روایات اور تمدن کو برباد کرنا اور وہاں پر موجود معدنیات اور دیگر تنصیبات و نوادرات پر قبضہ جمانا ہے۔

شاہین کاظمی عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں ابھرتا ہوا اک نیا نام ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ برف کی عورت چونکا دینے والا ہے۔ انھوں نے سماجی زندگی کے ہر پہلو کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنے ہر افسانے میں حیرتوں کا اک نیا در کھول کر قاری کو چونکا دیتی ہیں۔ کہانی کی بہترین بخت، گہرے

مشاہدے اور اپنے وسیع کائناتی مطالعہ کے ذریعے وہ جیتے جاگتے سانس لیتے اور سماج میں متحرک کرداروں کو اپنے افسانے کا حصہ بناتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کرب ان کی انگلی تھامے زمان و مکاں کے گھمبیر مسائل کے حیرت سرا میں داخل ہو رہا ہے۔ ان کے الفاظ گونگے بہرے نہیں بل کہ بولتی چلتی چلتی پھرتی تصاویر لگتے ہیں، ان کے بعض افسانوں مثلاً برف کی عورت، برزخ، آخری پنکھ، سیندھ، نرکتی، پتی ورتا اور کھپ میں عصری و سماجی شعور اور آفاقی دکھ کسی قدیم مزار پر موجود پرانے برگد کے درخت پر لٹکے رنگ بہ رنگ دھاگوں کی طرح الجھا ہوا انسانی روح کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

شاہین کاظمی نے عصر حاضر کے سماج میں مروجہ اور خود ساختہ روایات کی اونچی دیواروں تلے سسکتی زندگی، اس کی کرم خوردہ اقدار، مذہبی تعصب، خود پسندی، بے حسی، محرومیوں میں بسر ہوتے شب و روز اور جاہ و ثروت میں پلٹی جھوٹی انا، انسانی عقائد اور دیگر منہدم ہوتی تہذیبی اقدار و روایات اور مسائل حیات کو بڑی دیدہ دلیری سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ یقیناً ان افسانوں میں ان کی قوت متخیلہ اور فنی مہارت کی داد دینا پڑے گی۔ انھوں نے نسوانیت کا سہارا لے کر اک عورت کے جذبات و احساسات کو جس شدت اور گہرائی سے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سلمان باسط ان کے مطمح نظر کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

خود ساختہ روایات کی دیواریں کتنی ہی خستہ کیوں نہ ہو جائیں، ان کے سائے تلے عمریں  
گزار دینے والے ان کو منہدم کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے معاشرے کی  
کہنہ اور کرم خوردہ اقدار جانے کتنی بتولوں کی زندگیاں نگل گئی ہیں۔ ایسی فنکارانہ  
نفاست سے مذہب، عقیدے اور جھوٹی انا کے نام پر ڈھائے گئے ظلم کو بیان کرنا اور پھر  
اس بیانیے میں اتنا درد سمودینا کہ قاری کی رگوں کا خون نچونے لگے آسان نہیں۔ (۱۳)

یہی وجہ ہے کہ شاہین کاظمی کے افسانوں کو پڑھ کر منٹو اور عصمت چغتائی کا عہد رفتہ یاد آجاتا ہے۔ وہ سماج کی رومان انگیز مسرتوں اور بھول بھلیوں میں بھٹکتی نہیں بل کہ شاخ گل پر پھولے کو مل شگوفوں کی طرح قاری کی بے قرار روح کو تسکین جاں عطا کرتی ہیں۔ ان کے ہاں کرب میں ملبوس زندگی کے نقوش کہیں بھی دھندلے نہیں پڑتے بل کہ انفرادی سطح سے اٹھ کر آفاقی المیوں کی صورت اختیار کر

جاتے ہیں جس میں رشتوں کا الچھتاریشم بھی ہے اور ناآسودگی کا دکھ بھی۔ وہ انسانی روح کے اندر اتری بے حسی کی گہری دھند سے اپنے الفاظ کے لیے عطر کشید کرتی ہیں۔

انسان نے جب سے روحانیت پر مادیت پرستی کو ترجیح دی ہے تب سے اس کا اخلاقی زوال شروع ہوا۔ وہ اپنے رویوں اور سماجی زندگی کے اصول و آدرش کی بنا پر پہچانا جاتا ہے۔ مگر اس کے اندر احساس انسانیت ہی نہیں، صرف بے حسی اور خود غرضی کا احساس جاگزیں ہے تو کیا فائدہ ایسی زندگی کا سیندھ کا موضوع جعلی پیر پرستی اور محبت و ہوس کے روپ میں پلتی ہوئی بے چین روح ہے۔ مذہب کے نام پر لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا، مزاروں پر مجاور بن کر بیٹھنا، یہ سب بڑے صغیر کے خود ساختہ خانقاہی نظام کے عیوب کو ظاہر کرتے ہیں۔ مرادشاہ، دلدارشاہ، رجو، زہر اور ماں اس افسانے کے اہم کردار ہیں۔ وہ اس افسانے میں نام نہاد سماج کی ان پرستی کی بھینٹ چڑھتی معصوم کلیاں، بڑی عمر کے افراد سے بیاہ دیا جانا، خانقاہی نظام میں مذہبی دہشت گردی کا بڑھتار جحان، ان کی اس خود ساختہ ریاست میں عتاب کا نشانہ بننے لوگ، سادہ لوح لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنے والے جعلی پیروں کی کارستانیوں اور حرام و حلال کا فلسفہ بھی زیر بحث لائی ہیں۔ زہر اکا کردار ایک مجبور اور بے بس لڑکی کا کردار ہے جو اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھ رہی ہے مگر والدین کی ہٹ دھرمی کے آگے بے بس ہے۔ ان کے افسانے دیہات کی عکاسی، مذہبی شعور، سادگی اور خوشیوں سے بھرپور زندگی متوسط طبقے کے مسائل، قسمت کا لکھا کبھی نہیں ملتا جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ”سیندھ“ میں رجو کا کردار بہ نسبت زہر کے انتہائی متحرک نظر آتا ہے۔ اس میں اک عزم ہے۔ وہ حالات کا مقابلہ دیدہ دلیری سے کرتی ہے مگر زہر کے اندر ایک طرح کی بے بسی نظر آتی ہے بالآخر وہ کھوکھلے اور نام نہاد سماج کے آگے ہار جاتی ہے:

رجو نے ملیج رخساروں سے نچڑتا لہو اور لبوں کی لرزش بھانپ لی۔ جب لمبی مخروطی انگلیوں کی پوروں میں موت کی سی ٹھنڈک اتری تو وہ بنا کہے پاس پڑا چینیلی کے پھولوں والا تیل ہتھیلی پر انڈیل کر زہر کے لمبے بال کھولنے لگی۔ اس کی انگلیاں بہت ملائمت سے گھنے بالوں میں ڈوب ابھر رہی تھیں۔ کسی ہوئی سانولی رنگت والی بھری بھری کلائیوں میں پڑی سستی کانچ کی چوڑیوں نے ستار چھیڑ دیا۔ (۱۴)

افسانے میں منظر کشی یہاں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے کردار ”رجو“ کے ذریعے سماج کے ایسے چہرے بے نقاب کیے ہیں جو اسے آہستہ آہستہ دیمک کی طرح کھا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے متوسط طبقے پر امرائے ظلم و ستم اور ان دیکھے اعمال کا پردہ فاش کیا ہے۔ ملازمہ ”رجو“ کا کردار برصغیر میں سیاسی اور سماجی زندگی کا ایک طرف خوب صورت منظر نامہ پیش کرتا ہے تو دوسری طرف اس کا اپنی مالکن سے والہانہ لگاؤ اور فطری محبت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ بغیر کسی خوف کے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتی ہے، اگرچہ اسے علم ہے کہ اس کے اس رویے پر اس کی جان بھی جاسکتی ہے مگر وہ پروا نہیں کرتی۔ اونچی فصولوں میں سسکتی زندگی کی یہ داستان جس میں عورت کی مجبوری اور مرد کی بے حسی چھپی ہوئی ہے ہماری نام نہاد معاشرت کے گال پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ لوگ جوان لڑکیوں کو شادی جیسے سماجی بندھن کے نام پر بغیر ان کی مرضی کے بلی چڑھا دیتے ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے وہ اپنا نصیب نہیں لکھ سکتیں یہ حق بھی والدین کو حاصل ہے اسے اپنے گھر میں بھی آزادی سے سانس لینا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی گروی رکھی زندگی اور حسن و شباب میں وہ رنگینی نہیں ہے۔ اس کا اپنا مستقل گھر نہیں ہوتا۔ آج نہیں تو کل اسے جانا ہوگا:

جب سے مراد شاہ کی نظر زہر اپر نکلی تھی گرمیوں کی اس بھری راتوں میں موتیے اور  
جنگلی گھاس کی مہک لیے ہوا کے نرم جھونکے جیسی زہر امر جھاگئی تھی۔ اس موئے نامراد  
شاہ کو شرم بھی نہ آئی حویلی کا رخ کرتے ہوئے ایک زنانی تو ہنڈا چکا..... ایسوں کو تو  
موت بھی نہیں آتی۔ (۱۵)

بھیگتی آنکھوں میں لرزتی حیرت، لبوں کی لرزش اور ملیج رخساروں سے نچرنا ہوا، اس کی سنگین اور غم زدہ زندگی کا شاخسانہ تھا۔ ایک دل جس میں ارمان زہریلے ناگ بن کر اس کے پورے وجود میں پھیل کر اسے ڈس رہے ہیں مگر صبر اور اپنوں کی عزت کے سوا اس کے پیش نظر اور کچھ نہ تھا۔ زہرا بہ خوبی جانتی تھی کہ رات گئے اس کے بابا کے کمرے سے کون نکلا تھا۔ وہ مائی جی کے اندر بے بس اور روزمرتی عورت کو جگانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے کس مہر سی اور بے وفائی کا دکھ جان لیوا تھا۔ ان کی پُر نم آنکھوں کے ساون کا رخ ہمیشہ اندر کی طرف رہا۔ عورت چار دیواری میں قید سونے کی چڑیا ہے۔ آزادی اسے نصیب نہیں۔ اس کے حقوق بھی پامال ہوتے رہے۔ چڑیا کے پر کٹ گئے۔ جوانی گزر گئی

زہرا کے بہ ضد ہونے پر مائی جی کا کہنا تھا: ”اللہ رسول کے نام پر کیے گئے گناہ کی لذت بڑی وکھری ہوتی ہے ایک دفعہ سواد منہ کو لگ جائے تو بندہ حلال کھانے کے لائق نہیں رہتا“ (۱۶) وہ اپنے اندر چھپی تلخی کو نہ چھپا سکی۔ خود تو انھوں نے جیسے تیسے دل کے ارمانوں کے تپتے صحرا میں بے وفائی اور پیار کی پیاسی دھرتی پر سسک سسک کر زندگی گزار دی تھی مگر اب وہ زہرا کو اس آگ میں نہیں جھونکنا چاہتی تھی:

ماں جی غصے سے بولیں اور ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا لیکن اندر سلگنے لگا تھا۔  
 بے آواز چیخیں سینے میں دھواں بھرنے لگیں۔ مراد شاہ مردوں کے کس قبیل سے ہے  
 یہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں، اس کے نزدیک عورت نسل بڑھانے کی مشین کے علاوہ  
 کچھ نہ تھی لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ زہرا کے باپ دلدار شاہ کے گلے میں  
 پھنسی بڑی نکالنا مشکل ہے۔ (۱۷)

ماں جی کی بارہا کوشش کے باوجود دلدار شاہ نہ مانا اور زہرا کی شادی مراد شاہ سے کر دی گئی۔  
 علم کتابوں میں ضرور ملتا ہے مگر زندگی کی صحیح حقیقت انسان مشاہدے کے ذریعے سیکھتا ہے۔  
 زندگی میں درد اور جبر کی امر بیل بالآخر اس کے وجود کو جکڑ لیتی ہیں۔ اپنے باپ کی عمر کے مرد سے شادی  
 ہونا کہاں کا سماجی انصاف تھا۔ اس ظالم سماج میں اب بھی شعور نہیں آیا۔ یہاں بیورو کریٹ، اسمبلی اور  
 حاکمیت کا لالچ مراد شاہ کی ہوس کو ظاہر کرتا ہے۔ سیاسی مصلحت اور ذاتی مفاد کی خاطر دلدار شاہ نے اپنی  
 جوان بیٹی کی بلی چڑھا دی، اونچے گھرانوں کی کھوکھلی انارپرست زندگی، جھوٹی شان و شوکت اور جو رسٹم  
 سے مزین حیات، جس کی مسکراہٹوں اور بھڑکیلے لباس کے پیچھے اک کرب چھپا ہوتا ہے۔ ان اونچی  
 فصیلوں کے پیچھے دم توڑتی انسانیت اور کرب سہتی حسرتیں اپنا وجود کبھی مستحکم نہیں رکھ پاتیں اور ان  
 اونچی دیواروں کے اندر چھپاؤ کھ کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ یہ اخلاق، جنت اور دوزخ دلانے کے  
 ٹھیکے دار، دولت کے پجاری، نصیب و شرافت کی دہلیز بھی پار نہیں کر سکتے۔ گدی نشین گھرانوں کی  
 مراعات، مشاغل اور عیش و عشرت میں ڈوبی زندگی کے ارمانوں کی ڈور لمبی ہوتی ہے مگر غربا کی آرزوؤں کی  
 پیاس میں سسکتی اور ہلکتی زندگی، روح کی سلوٹوں میں مدہم ہوتی دکھ کی کرنیں بالآخر خاک نشین ہو جاتی  
 ہیں۔ عورت کبھی سانجھ برداشت نہیں کرتی مگر زہرا مراد اپنے گھر میں مریدنیوں کے ساتھ حویلی اور

حجرے میں مرادشاہ کی رنگ رلیوں سے واقف تھی اسے ماں کی طرف داری حاصل تھی۔ ساس اور بہو کی ازلی نفرت کو بھی انھوں نے نشانہ تنقید بنایا ہے۔

رجو اک بے کس اور مجبور طبقے کی عکاسی کرتا ہوا کردار ہے۔ رجو کے ساتھ ہونے والی زیادتی برصغیر کے سماج کی باوقار اشرفیہ، جن سے لوگ دین و ادب سیکھتے ہیں، بگڑے ہوئے اس خانقاہی نظام کے منہ پر زور دار تھپڑ ہے جو مذہب کی آڑ میں لوگوں کی عزت تارتا کرتے ہیں۔ وہ سیندھ لگانے گئی تھی مگر حجرے میں اپنی عزت کو سیندھ لگوا بیٹھی۔ اس افسانے میں مرادشاہ کا کردار اک زہریلے ناگ کی طرح ہے جس نے اسے ڈس لیا۔ مگر دوسری دفعہ کی کوشش میں رجو نے مرادشاہ کا قصہ ہی ختم کر دیا اور اسے زہر پلا دیا۔ رجو سماج کے باغی افراد کی نمائندہ ہے۔ افسانے کا اختتام انتہائی لرزہ خیز اور ڈرامائی انداز میں ہوا ہے۔ اس دھماکا خیز انداز میں بغاوت کا عنصر نمایاں ہے جس سے منٹو یاد آتے ہیں۔ سماج اور اس کی اقدار، نام نہاد روایات اور رسوم کے خلاف باغی ہونا آسان نہیں اس میں بھی اک کرب چھپا ہے۔

الختصر شاہین کاظمی کے علاوہ دیگر افسانہ نگاروں کے ہاں بھی یہی موضوعات اپنے وسیع تر تناظر میں دکھائی دیتے ہیں۔ عصر حاضر میں اُردو افسانہ اپنے ناسودہ ماحول، انسانی رگوں میں پھیلے خوف اور اپنے گرد و پیش میں پھیلے درد کو اپنے اندر سمیٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، مثال کے طور پر تہذیبی و سماجی اقدار و روایات کی پامالی، کھوئے ہوؤں کی کھوج، تہذیبی انتشار، انسان کا اخلاقی زوال، جنسی بھوک، انسانی جارحیت کے بدلے میں پیدا ہونے والی بد امنی، عائلی زندگی کے بدلتے تقاضے اور رجحانات، جنسی بے راہ روی، بے حسی، خود پسندی، انا پرستی، جاہ و ثروت اور جھوٹی شان و شوکت، رشتوں کا الجھتا ریشم، ماضی پرستی، بدلتے لہجوں کا ڈکھ، بالادست طبقے کی ہٹ دھرمی، متوسط طبقات کی تباہ حالی، سماجی و سیاسی مصلحتیں، غربت میں سسکتی زندگی، خود شناسی و جہاں شناسی، دہشت گردی، تنہائی کرب، نفسیاتی خلفشار، حقائق زمانہ، نفسیاتی الجھنیں، متغیر ہوتی زندگی کے مسائل، تہذیبی بگاڑ، سماجی رویے، نوجوان نسل کی بے روح حیات، ارمانوں کی آگ میں سلگتی زندگی، در بہ دری کا احساس، سامراجی نظام کی تلخیاں اور جو رسیم، خود ساختہ مذہبی عقائد، پیٹ اور تن ڈھانپنے کی بھوک، احساس ذات کا نوحہ، تہذیبی و سماجی رکھ رکھاؤ، پیار کی رم جھم بارش، زندگانی کے تلخ حقائق، خانقاہی نظام کے در پردہ مسائل، جنسی تفریق، مذہبی فسادات،

فطرت کا تحفظ، سماجی اقدار کی شکست و ریخت، عالمی تشدد، مذہبی دہشت گردی، حب الوطنی، عصر حاضر میں خون آشام زندگی کے مناظر، جذبہ و رومان، ناسودگی کا دکھ، محرومیاں، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، ظاہری انارکی، سماجی نا انصافی، بڑھتی ہوئی طبقاتی کش مکش، مذہبی تعصب، معاشی استحصال، جبر و استبداد کے شکنجے میں پستی انسانیت، بے رحم زندگی کے دو پاٹوں میں پاش پاش ہوتے ارمان اور تہذیبی کرب معاصر افسانے کے نمایاں موضوعات ہیں۔



### حوالے

- (۱) زیر شاہ، ڈاکٹر سید / آفریدی، محمد عمران، ”اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کا تنوع“، مشمولہ مجلہ نور تحقیق، جلد ۳، شمارہ ۱۰ (لاہور گریجویٹ یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۱۶۔
- (۲) طاہر نقوی، ”بندلیوں کی چیخ“، مشمولہ: بند لیوں کی چیخ، (کراچی: ادارہ ممتاز مطبوعات، ۱۹۸۲ء)، ص ۹۰۔
- (۳) ایضاً، ”بندلیوں کا دکھ“، مشمولہ ایضاً، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔
- (۴) عذرا نقوی، ”الی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے، مشمولہ: آنگن جب پر دیس ہوا (دہلی: ایجوکیشنل ہاؤس، طبع دوم، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۴۔
- (۵) مہتاب عالم پرویز، ریت پر کھنچی ہوئی لکیر (نئی دہلی: ماڈرن پبلسنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء)، ص ۲۹۔
- (۶) اشتیاق سعید، ”ایک کفن اور“، مشمولہ: ہل جوتا (ممبئی: اعظمی پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۶۵۔
- (۷) اشتیاق سعید، ”بہ رضائے صنم“، مشمولہ: ہل جوتا، (ممبئی: اعظمی پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۴۸۔
- (۸) تحسین بی بی / ناصر آفریدی، ”اکیسویں صدی کے چینلجز اور زاہدہ حنا کا فن: امکانات و مباحث“، مشمولہ مجلہ نور تحقیق، جلد ۳، شمارہ ۱۰، (لاہور گریجویٹ یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۷۔
- (۹) طارق چٹاری، جدید افسانہ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۲۳۔
- (۱۰) احمد عقیل روہی، ”ہستیاں ڈھونڈنے والی“، مشمولہ زاہدہ حنا، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مرتبہ: آسیہ نازلی، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۶۴۔

- (۱۱) زاہد حنا، ”جاگے ہیں خواب میں“، مشمولہ رقص بسکل ہے، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، مارچ ۲۰۱۱ء)، ص ۱۶۸-۱۶۹۔
- (۱۲) ایضاً، ”نیند کا زرد لباس“، مشمولہ ایضاً، ص ۱۶۰۔
- (۱۳) سلمان باسط، ”اک اور طلسم ہوش ربا: مقدمہ“، مشمولہ برف کی عورت از شاہین کاظمی، (اسلام آباد: ایمیل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۴۔
- (۱۴) شاہین کاظمی، ”سیندھ“، مشمولہ برف کی عورت (اسلام آباد: ایمیل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۱۔
- (۱۵) ایضاً، ص ۲۴۔
- (۱۶) ایضاً، ص ۲۲۔
- (۱۷) ایضاً، ص ۲۵۔

